**Al-Mīthāq** ***(Research Journal of Islamic Theology)***
**ISSN:** 2791-0989 (P), 2791-0997 (E)
**Volume** 04, **Issue** 01, January-March 2025, **PP**: 99-121
**Open Access at**: https://almithaqjournal.org/

Article QR

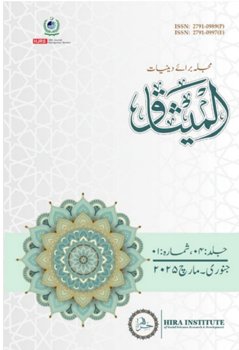

# عقیدہ توحید اور انسانی نفسیات: تاثرات و تطبیقات کا تجزیاتی مطالعہ

# *Monotheism and Human Psychology: An Analytical Study of Impressions and Applications*

**1. Dr. Moazzam Ali**
alimoazzam91@gmail.com

*CTI,*
*Government Graduate College,*
*Civil Lines, Sheikhupura.*



| | |
|---|---|
| ***How to Cite:*** | Dr. Moazzam Ali. 2025: "Monotheism and Human Psychology: An Analytical Study of Impressions and Applications". Al-*Mīthāq (Research Journal of Islamic Theology)* 4 (01): 99-121. |
| ***Article History:*** | **Received**: 20-02-2025 · **Accepted**: 15-03-2025 · **Published**: 25-03-2025 |
| ***Copyright:*** | **©The Authors** |
| ***Licensing:*** | This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License. |
| ***Conflict of Interest:*** | Author(s) declared no conflict of interest. |



***Abstract & Indexing***

***Publisher***

HIRA INSTITUTE
*of Social Sciences Research & Development*

# عقیدہ توحید اور انسانی نفسیات: تاثرات و تطبیقات کا تجزیاتی مطالعہ

# *Monotheism and Human Psychology: An Analytical Study of Impressions and Applications*

**Dr. Moazzam Ali**
*CTI,*
*Government Graduate College, Civil Lines, Sheikhupura.*
*alimoazzam91@gmail.com*


## Abstract

The concept of the oneness of God has profound implications for human psychology. The belief in a singular, absolute divine presence provides a framework for understanding existence, morality, and personal identity. Psychological studies suggest that a sense of unity and purpose, often derived from faith in one God, contributes to mental stability, reduced anxiety, and greater resilience in the face of adversity. Moreover, the idea of divine oneness aligns with cognitive tendencies toward pattern recognition and the human need for coherence in life experiences. The relationship between divine oneness and psychology is evident in spiritual practices, which often cultivate mindfulness, inner peace, and moral responsibility. This paper explores how the concept of God's oneness influences human thought, emotional well-being, and behavioral patterns, highlighting the interconnectedness of theology and psychology in shaping human experience.


***Keywords:*** *Implication, Human Psychology, Morality, Anxiety, Mindfulness, Interconnection.*

## تعارف

اسلام، کامل ضابطہ حیات ہے جس کے فطری دین ہونے کا دعویٰ، داعییّن اسلام کی تحریر و تقریر میں کثرت سے ملتا ہے۔ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُم[1] (تمہارے لیے دین کامل کر دیا) کا عَلَم صرف اسلام کے قلعہ کا خاصا ہے۔ راقم الحروف کے مطابق دینِ کامل و اکمل اور فطری ہونے سے یہی مراد لی جاسکتی ہے کہ ایسا دین جس میں انسانی زندگی سے ملحق سبھی پہلوؤں کے بارے میں مفصّل و درست رہنمائی موجود ہو۔ دکھ و تکلیف، خوشی و غمی، جزا و سزا، عدل و انصاف وغیر ھم۔ جیسا کہ فرمان عالیشان ہے کہ:

فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ[2]

اللہ کی ڈالی ہوئی بنا جس پر لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی چیز نہ بدلنا۔ یہی سیدھا دین ہے۔

الغرض! ایسی کوئی کیفیت باقی نہیں رہی جس کے بارے میں اسلام نے قولی و فعلی مثال قائم نہ کی ہو۔ شاید! یہ صرف اسلامی تعلیمات کا ہی خاصا ہے کہ غیر متبعین کے لیے بھی اُتنی ہی کارآمد اور مفید ہیں جتنی اسلام کا اتباع کرنے والوں کے لیے۔ اسلام کے اصول و ضوابط کو جو بھی اپنا لے گا دنیوی زندگی میں اِن کے ثمرات سے لازم بہرہ مند ہو گا۔ اِسی لیے اسلام کو دین فطرت کہا گیا ہے کیونکہ اِس میں وہ سبھی قواعد عملی صورت میں بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر نظمِ کائنات منحصر ہے۔

نظامِ کائنات کی بنیادی اکائی عمل تدریج ہے، جسے خالق و مالکِ دوجہاں نے اپنی مرضی و منشاء سے قائم فرمایا۔ جس پر مشاہدہ کائنات دال ہے کہ سبھی ارتقائی مراحل کے محتاج ہیں، جن سے گزر کر ہی تکمیل اور پھر تنزّلی کی طرف سفر جاری ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمۡ وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ لِكَىۡ لَا يَعۡلَمَ بَعۡدَ عِلۡمٍ شَيۡـًٔا[3]

اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہاری جان قبض کرے گا اور تم میں کوئی سب سے ناقص عمر کی طرف پھیرا جاتا ہے کہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔

اِس نظم وضبط میں اللہ تعالیٰ نے کئی مخلوقات کے بیچ انسان کو عقل و شعور جیسی نعمتوں سے نواز کر مبعوث کیا، جس کی رہبری و رہنمائی کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ساتھ صحائف و کتب بھی نازل فرمائیں جو عمل تدریج کا ہی بیّن ثبوت ہیں۔ لہٰذا! تغیّر ایک وقوع پذیر رہنے والا عمل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ:

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ[4]

اور یہ دن ہیں جو ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔

لیل ونہار، طلوع و غروب، عروج وزوال یہ سب تغیّر ہی کی مثالیں ہیں۔ پھر تغیّرات بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک اختیاری تغیّر اور دوسرا غیر اختیاری تغیّر۔ اختیاری تغیّر میں وہ تمام اعمال و اقوال شامل ہیں جنہیں جاندار اپنے عزم و ارادہ سے سرانجام دے سکتا ہے اور غیر اختیاری تغیّر میں مذکورہ افعال کے علاوہ باقی ماندہ تمام امور شمار کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس سے ایسا ہرگز مراد نہیں لیا جانا چاہئے کہ انسانی طبع پر صرف اختیاری تغیّرات ہی اثر انداز ہوتے ہیں اور غیر اختیاری تغیّرات کا اپنا ایک الگ جہان قائم رہتا ہے بلکہ اثرات کے لحاظ سے دونوں کا یکساں مقام ہے۔ بعض اوقات غیر اختیاری تغیّرات اپنے مقابل کی بہ نسبت زیادہ اثر پذیر اور دیرپا ہوتے ہیں، جبکہ اصل معاملہ ان تغیّرات کے ردِ عمل کے نتیجے میں حاصل ہونے والے نتائج پر توجہ مرکوز کرنا ہوتا ہے۔ مثبت ہیں کہ منفی، طویل ہیں یا مختصر، دائم ہیں یا عارضی اس کا فیصلہ حاصل شدہ نتائج کی ترتیب و تنظیمِ نَو کرنے پر ہوتا ہے۔ انسان کی تربیت و تنظیم کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔

تربیت کا عمل بھی ہمیشہ تغیّر پذیر اور دائم جاری وساری رہتا ہے۔ یہ ایک صبر آزما، کٹھن اور اعصاب شل کر دینے والی سخت قسم کی آزمائشوں پر مشتمل تادمِ آخر جاری رہنے والا عمل ہے اور اگر اسلام کی طرف سے عطاء کئے گئے تربیتِ فرد کے فلسفے کو پرکھا جائے تو یہی وہ فعل ہے جس کے بارے میں روزِ محشر باز پُرس و جوابدہی ہوگی۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی (صلى الله عليه وسلم) ہے کہ:

كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ[5]

تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم میں ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

تربیت، نشوونما، پروان چڑھانا، شبانہ روز انتھک محنت والا کام ہے۔ ایک پھول یا پودے کی دیکھ بھال میں مالی کو موسمی حالات، بیماریوں سے بچاؤ اور کھاد کے استعمال کا جس قدر صحیح اور مؤثر ادراک ہوگا، اسی قدر بہتر نشوونما ہوگی اور جب معاملہ انسان کی تربیت کا ہو تو نزاکتوں اور حفاظتوں کا نظام اور بھی زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔ جس طرح کسان کو اپنی مطلوبہ فصل حاصل کرنے کے لیے کھیت کو منتخب کردہ جنس کے لحاظ سے تیار کرنا پڑتا ہے۔ ایسا نہیں کہ گندم کے حصول کے لیے چاول کا بیج کاشت کرنے کے تمام مراحل اختیار کیے جائیں اور یقین رکھا جائے کہ مطلوبہ فصل ہی حاصل ہوگی۔

اسی طرح انسان کو اعلیٰ اخلاقی اقدار سے مزیّن، اعتدال پسند، باہمی اتحاد و اتفاق سے رہنے والا اور معاشرے کے لیے مفید فرد بنانے کے لیے ظلم وزیادتی، تفرقہ بازی اور انتشار پرستی کا راستہ نہیں اپنایا جاسکتا۔ کارآمد فرد بنانے کے لیے زندگی میں بامقصد اور درست نصب العین کا ہونا ضروری ہے اور ایسا نصب العین جو کاروانِ حیات کی تمام ضرورتوں، تقاضوں اور مسائل کا کافی وشافی حل اپنے دامن میں پنہاں رکھتا ہو، صرف اسلام ہی دے سکتا ہے کیونکہ اسی کے دامن میں کامل و اکمل ہونے کا عملی دعویٰ موجود ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی فراہم کرتا ہے، کامیابیوں اور کامرانیوں کا درخشاں باب اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ میانہ روی، اپنے دعویٰ کے ثبوت میں

مؤثر دلائل، اعلیٰ اخلاقی اقدار اور قوتِ متحرکہ و قوتِ نافذہ کا متحمل ہے۔

مختصراً! اسلام ہی وہ دین ہے جس نے انسان کی فلاح و اصلاح کو سب سے زیادہ مقدم رکھا ہے کیونکہ فرد معاشرے کی اکائی ہے اور معاشرہ انہی اکائیوں کے باہمی اتحاد و اتفاق سے وجود میں آتا ہے اور مثالی معاشرہ اُسے ہی گردانا جا سکتا ہے جو مختلف النوع اکائیوں کے آپس کے اختلافات و افتراقات کے ہوتے ہوئے دو قالب یک جاں کی مانند ہو۔ ہر اکائی حقوق و فرائض کے مساوی مقام پر فائز ہو۔ کسی ایک کو دوسرے کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنا روا نہ ہو۔ ہر ایک کو یقین ہو کہ وہ جس معاشرے کا حصہ ہے وہ معاشرہ عدل و انصاف کے نظام سے مزیّن ہے۔ ایک کمزور فرد بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل ہو جتنا کہ کوئی صاحبِ ثروت۔ طاقتور، کمزور کے لیے سہارا ہو اور کمزور فرد طاقتور کے لیے ممد و معاون۔ باہمی یک جہتی کا عملی نمونہ خوبصورت اور پائیدار عمارت کی مانند ہو، جس کی ہر ایک اینٹ، دوسری اینٹ کو سہارا اور مضبوطی فراہم کرتی ہے۔ چاہے ان میں سے کوئی ایک کسی اعلیٰ مہارت رکھنے والی کاریگر نے لگائی ہو یا ناقص ہنر رکھنے والے کاریگر نے۔ سب اینٹیں مل جل کر ایک عمارت کا نقشہ بناتی ہیں۔ یہی تعلق فرد اور معاشرے کا بھی ہے۔ ہر فرد کی اپنی اہمیت اور مقام ہے۔ کسی فرد کو اگر عدل و انصاف اور قوانین کے یکساں نفاذ کے بغیر اپنے مرتبہ سے الگ کیا جائے تو معاشرے میں ناہمواری اور ظلم و زیادتی جیسے عناصر کی ترویج ہوتی ہے اور پھر یہ سلسلہ ایک دن پوری عمارت کو منہدم کرنے کا سبب بنتا ہے۔

ایک مثالی معاشرہ میں افراد کی باہمی گفت و شنید، تنقید و تنقیص اور بحث و مباحثہ وہی حیثیت رکھتا ہے جو باغیچہ کی خوبصورتی اور دلکشی کو قائم رکھنے کی لیے مالی کی طرف سے کی جانے والی کانٹ و تراش کو حاصل ہے۔ اگر مالی پھولوں کی خوبصورتی اور نزاکت کو مدِ نظر رکھے اور اسی میں محو رہے تو پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ جب باغیچہ بد صورتی اور بے ترتیبی کا عملی نمونہ ہو گا اور اس کی وجہ مالی کا وضع کردہ نظم و ضبط کے نظام سے انحراف کرنا ہو گا۔ گویا کہ مالی کی حیثیت، باغیچہ کے لیے ایک سربراہ، محافظ اور تربیت کنندہ کی ہے۔ جس نے مسائل کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے، وسائل کو بہتر حکمت عملی، انتھک محنت اور جہدِ مسلسل سے استعمال کرتے ہوئے پودوں کی آبیاری کرنی ہے جو نہ صرف دوسروں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بلکہ مفید و کار آمد بھی ہو۔ تشکیلِ معاشرہ کے لیے یہی حیثیت اصلاح فرد میں سربراہانِ خانہ اور علمائے کرام کو حاصل ہے۔

علماء معاشرتی وجود میں ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہیں جبکہ ملی وجود میں روحِ جاں ہیں۔ علماء کرام انفرادی و اجتماعی سطح پر معاشرے کے رہبر و رہنما ہوتے ہیں جس طرح انسانی وجود کو طبّی لحاظ سے ہڈی، گوشت اور خون میں تقسیم کیا جاتا ہے اِسی طرح معاشرتی و ملی وجود کو بھی تین طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربّانی ہے کہ:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ[6]

اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔

پہلا طبقہ جس میں ایسے افراد کو رکھا جا سکتا ہے جو عمومی طرز کی تعلیم حاصل نہیں کرتے یا حاصل کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، روز مرّہ معمولاتِ زندگی کو انجام دیتے ہیں اور اِسی ڈگر پر چلتے چلتے فی القبور جا ٹھہرتے ہیں۔ ایسے افراد پر مذہبی تعلیمات کی تقلید لازم ہوتی ہے تاکہ شناخت قائم رہے کہ یہ طبقہ کس مذہب و مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسرا طبقہ محض رسمی تعلیم حاصل کرنے ولے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جس میں دینی و دنیوی تعلیم شامل ہوتی ہے لیکن یہ افراد بامِ عروج تک پہنچنے کی تگ و دو نہیں کرتے۔ عمومی طور پر ایسے افراد مبلغ کے فرائض سر انجام دیتے ہیں لیکن ان کے پاس اجتہاد و استدلال کی قوت و اختیار نہیں ہوتا۔ اِن پر بھی اپنے سے بالا طبقہ کی تقلید کرنا لازم ہوتا ہے۔

تیسرا طبقہ میں ایسے افراد آتے ہیں جنہوں نے خود کو مذہب کے لیے وقف کر دیا ہے۔ جن کی فکر و عمل سے مذہبی تعلیمات اپنی حقیقی صورت میں نظر آتی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر خالق ومالک کی یاد تازہ ہو جائے۔ جن کی صورت میں، محمد مصطفٰی ﷺ کی جھلک نظر آئے اور جن کی سیرت میں، سیرتِ احمدِ مجتبیٰ ﷺ کا عکس دِکھے۔ ایسے اہلِ علم کو ہی انبیاء کرام علیہم السلام کا وارث کہا گیا ہے۔ اس طبقہ کے پاس اجتہاد و استدلال کی قوت و اختیار بھی ہوتا ہے اور اِنہی کے دم قدم سے ملی وجود بھی قائم رہتا ہے۔ باقی ماندہ طبقات پر اِن علماء کی اطاعت و پیروی لازم ٹھہرتی ہے کیونکہ:

إِنَّ العُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ[7]

بلاشبہ علماء، انبیاء کرام (علیہم السلام) کے وارث ہیں۔

مندرجہ بالا بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقالہ نگار کے نزدیک نظم کائنات کا محور و مرکز ہستی، انسان ہی ہے۔ یہ سب صناعی، صانع کی جناب سے انسان کی ذات کے لیے کی گئی ہے اور اِسی کی فلاح و اصلاح اوّلین مقصدِ کائنات ہے جس کے لیے تدریجی مراحل میں امورِ تربیت و تنظیم منّظم کئے گئے ہیں جنہیں فی زمانہ علمِ نفسیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

عنوانِ بحث کو مدّ نظر رکھیں تو سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ انسان کے بارے میں مذہب کی نفسیات سے کیا مراد ہے؟ اور جدید تعلیم میں علوم نفسیات کا مقصد و مرکز کیا بنتا ہے؟ کیا مذہب کی تعلیمات کا بھی وہی محور و مرکز ہے جو نفسیات کا ہے یا کارِ دیگر؟ پیش نظر صفحات میں اسلامی تعلیمات کے اِسی پہلو کو عقیدہ توحید کی روشنی میں سمجھنے کی تگ و دو کی جائے گی کہ یہ عقیدہ کس طرح انسان کی نفسیات پر اثر انداز ہوتا ہے اور دنیا میں فکری لحاظ سے موجود دیگر عقائد سے کس قدر اختلاف رکھتا ہے، تاکہ اسلامی تعلیمات کی حقانیت پہلے کی نسبت واضح تر ہو جائے۔

کسی بھی مذہب کی بنیاد، اُس کی تعلیمات میں بیان کئے گئے عقائد کی بنا پر جانچی جاسکتی ہے، جن میں اوّلیت عقیدہ معبودیت کو حاصل ہے اور ثانوی درجہ پر داعیِ دین و مذہب کی مبعوثیت ہے، جسے عقیدہ رسالت بھی کہا جاتا ہے۔ یہی دونوں عقائد، باقی سب عقائد پر فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ عبادات، معاملات، اجتہادات و دیگر تعاملات سبھی ضمنی مباحث کی اہمیت رکھتے ہیں جب تک کہ عقیدہ توحید و رسالت کا تصوّر، ایمان وایقان کی حیثیت اختیار نہ کر لے۔ جب یہ تصوّرات متبعینِ مذہب کے اذہان میں راسخ ہو جاتے ہیں تبھی انسانی نفسیات میں انقلاب آنا شروع ہوتا ہے اور ذیل کی بحث میں یہی دیکھنا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں یہ عقیدہ کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟ اور مسلمان کی نفسیات کو کیسے ترتیب و تنظیم میں لاتا ہے؟

## عقیدہ توحید: تاثرات و تطبیقات کا جائزہ

اسلامی تعلیمات میں عقیدہ توحید، باقی سبھی عقائد کی اساس تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ اہل اسلام کی نفسیات پر مندرجہ ذیل طریقوں سے اثر انداز ہو سکتا ہے:

### اول: وسعتِ قلب

اسلامی تعلیمات کا بنیادی خاصا ہے کہ وہ اپنے متبعین کی فکر و نظر میں وسعت پیدا کر دیتی ہیں۔ جس کی بنا عملِ تقویٰ پر ہے۔ تقویٰ اختیار کرنے سے ریاکاری ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا عمل ہے جو صرف اللہ اور اُس کے بندے کے درمیان تعلق پر منحصر ہے۔ جس قدر انسان اِس عمل میں پختگی حاصل کر تا جائے گا اُسی قدر لائق تکریم و تعظیم ہوتا جائے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[8]

بیشک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔

راہِ تقویٰ پر چلنے سے انسان کی طبیعت میں وسعت آجاتی ہے۔ دنیوی اغراض و مقاصد کی ادائیگی صرف اللہ تعالیٰ کے حضور میں خود کو سرخرو دیکھنے سے منسلک ہو جاتی ہے۔ دکھ، تکالیف، مصائب و پریشانیاں اُسے کسی بھی طرح کے رنج والم میں مبتلا نہیں کر پاتیں۔ مطمع نظر صرف اُخروی کامیابی ہوتی ہے لیکن دنیاوی حیات میں اُن کا طرز عمل بے رغبتی کی بجائے منصفانہ ہوتا ہے۔ فرائض و واجبات میں غفلت برتنے کی بجائے اُنہیں احسن انداز میں سرانجام دینے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ راہبانہ طرزِ حیات کو اختیار کرنے کی نسبت میدان کار زار میں عملی جدوجہد کو اپنا خاصا بناتے ہیں کیونکہ منزلِ مقصود کے حصول کا واحد ذریعہ سیرت مصطفیٰ ﷺ ہے جس میں تقویٰ کو بہترین زادِ راہ کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ [9]

اور توشہ ساتھ لو کہ سب سے بہتر توشہ پرہیز گاری ہے۔

بندہ خدا جب راہِ راست پر چلتے چلتے تقویٰ کے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جس کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے تو پھر حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ[10]

مؤمن کی فراست سے ڈرو، بے شک وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہوا کہ اسلام انسانی نفسیات میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ فکر و عمل میں بلند نگاہی کا عنُصر نمایاں تر ہو جاتا ہے۔ جس کے سبب انسان عارضی مفادات سے ماوراء ہو کر مستقل مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کو اپنا طرّہ امتیاز بنالیتا ہے۔ تقویٰ، سبھی آلائشوں سے پاک کر کے معبودِ برحق کی جناب میں باعث عزّ و تکریم بنا دیتا ہے۔

## دوم: مرکزیت

مغربی مفکرین کی تحقیقات کا جب مطالعہ کیا جائے تو جو بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہے وہ یہی کہ انہوں نے بھی اسلام کو توحیدی مذہب ہی لکھا ہے جس میں صرف ایک خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔ توحیدی مذہب ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اِس مذہب کے ماننے والے ہمیشہ خدائے واحد کی عبادت کرتے ہوں گے اور اُن کی فکر و سوچ دربدر بھٹکنے کی بجائے ایک ذات پر مرتکز ہوگی جس سے یہ ثابت ہوا کہ اُن افراد کی تمناؤں، آرزؤں اور خواہشوں کا محور و مرکز ایک ہی ہو گا جو اُنہیں مرکزیت فراہم کرتا ہے۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مرکزیت متبعینِ مذہب کو ملتی کیسے ہے؟ کونسا ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جاتا ہے جو انسان کو یقین دلاتا ہے کہ معبودِ برحق صرف ایک ہی ہے؟ سابقہ الجھے افکار کو کس طرح سلجھایا جاتا ہے کہ خدائے واحد ہی کائنات کا محور و مرکز ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر انسان کو غور و فکر کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے جس کے سبب وہ اپنے ارد گرد ہونے والے معاملات کا مشاہدہ کر کے صحیح و غلط کا تجزیہ کر سکتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا [11]

اللہ حکمت دیتا ہے جسے چاہے اور جسے حکمت ملی اسے بہت بھلائی ملی۔

غور و فکر کرنے کے حوالے سے بھی قرآن مجید میں دیگر مقامات پر بیان ہوا ہے کہ:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا [12]

تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر وہ غیر خدا کے پاس سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔

مذکورہ بالا آیات اس بات کی غمازی ہیں کہ انسان کو حکمت و دانائی کی صلاحیت، غور و فکر کرنے کے لیے دی گئی ہے اور سوچ و بچار کرنے کے لیے کتب سماویہ میں سے واحد کتاب قرآن مجید ہے جو اپنی اصلی صورت میں محفوظ ہے، جس پر غور و فکر کیا جائے اور آیات بیّنات کا مشاہدہ کر کے خالق و مالکِ دوجہاں سے آشنائی حاصل کی جائے۔

دین اسلام کی چونکہ بنیاد ہی قرآن مجید ہے اس لیے اسلام کو تسلیم کرنے سے قبل ایک خدا پر ایمان لانا لازم امر ہے، جس کے بغیر اسلام قبول کرنے کا دعویٰ محض قیاس آرائی کے کچھ نہیں۔ اس لیے جس مذہب کی اساس ہی عقیدہ توحید ہے اُس کے متبعین کے افکار و نظریات ہمیشہ ایک مرکز پر مرتکز رہیں گے کیونکہ قرآن مجید غور و فکر کرنے کے ساتھ اہل عقل و شعور پر حجت قائم کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ [13]

اور اگر تمھیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے (خاص) بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ۔

اِتمام حجت کے بعد قرآن مجید سبھی انسانوں کو یکساں مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے جس نے ساری کائنات کو اکیلے تخلیق فرمایا:

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [14]

اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز کا مختار ہے، اسی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں۔

تخلیق کائنات کا مضمون قرآن مجید میں متعدد بار ذکر ہوا ہے جس سے یہ بات واضح تر ہو جاتی ہے کہ مخلوق کا خالق صرف ایک ہے جو زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو پیدا کرتا ہے جیسا کہ:

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ [15]

بیشک اللہ دانے اور گٹھلی کو چیرنے والا ہے زندہ کو مردہ سے نکالنے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا۔

اُس خالقِ کائنات کی تخلیق میں کسی قسم کی کوئی کجی، عیب یا نقص نظر آتا ہے کیا؟ ذرا اپنی نگاہیں آسمانوں کی طرف دوڑا کر تو دیکھیں اور پھر بتائیں کہ کہیں کوئی خامی کا شبہ بھی گزرا ہو:

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًامَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ [16]

جس نے سات آسمان بنائے ایک کے اوپر دوسرا، تو رحمٰن کے بنانے میں کیا فرق دیکھتا ہے تو نگاہ اٹھا کر دیکھ تجھے کوئی رخنہ نظر آتا ہے۔

نظمِ کائنات کی بقا پر غور و تدبّر کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اگر اِس کائنات میں دو خالق ہوتے، دو الٰہ ہوتے تو اب تک فساد برپا ہو چکا ہوتا اور پورا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ نظام کائنات کا استحکام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اِسے چلانے والا صرف ایک ہی الٰہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا [17]

اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو ضرور وہ تباہ ہو جاتے۔

مندرجہ بالا اقتباسات کا مطالعہ بجا طور پر ہر انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ قلب و زبان سے پکار اُٹھے کہ:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ [18]

اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ آپ زندہ اور اوروں کا قائم رکھنے والا۔

قرآنی آیات کے یہی پہلو ایک مسلمان کو مرکزیّت فراہم کرتے ہیں کہ ایک ہی ذات ہے جس نے انسان کو شعور عطاء کیا۔ پھر اُسی شعور کو استعمال میں لاتے ہوئے قرآن مجید میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی۔ اگر شکوک و شبہات دور نہیں ہوئے تو ویسی ہی آیات لانے کی کھلی دعوت دی کہ اگر استطاعت رکھتے ہو تو اِس قرآن جیسا کوئی کلام لے آؤ۔ اِس اتمامِ حجت کے بعد بھی خدائے واحد نے عقل و فہم کو جھنجھوڑنے کے انداز میں فرمایا کہ میری تخلیق کی ہوئی کائنات کا مشاہدہ کر کے بتاؤ کہ کہیں پر کوئی عیب و نقص نظر آتا ہے۔ اِن سب کے باوجود بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کو انسان کی فلاح اس قدر محبوب ہے کہ مزید غور و فکر کی دعوت دی۔ اس طرح خدائے واحد کی ذات پر تقویٰ اختیار کرنے سے انسانوں کو ایک مرکز و محور ملتا ہے۔ اُن کے سبھی افکار و نظریات یکجاں ہو کر ایک مقام پر مرتکز ہو جاتے ہیں جو اہلِ اسلام کو ایک لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ امت ایک جسم کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے جس کا قلب اللہ واحدہ لاشریک ہوتا ہے اور یہی مرکزیت کا بنیادی سبب ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے شاید اِسی زُمرے میں کہا تھا کہ:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات [19]

## سوم: طمانیتِ قلب

طمانیت، کیفیاتِ قلبی کا نام ہے جس میں نشیب و فراز معمولاتِ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ قلب، اسلامی تعلیمات میں انسان کی فلاح و اصلاح کے لحاظ سے خاص موضوعِ بحث رہا ہے۔ راہِ سلوک کے متلاشیوں کی منازل میں ایک منزل اطمینانِ قلب کی بھی آتی ہے کہ جہاں پہنچ کر اُن کا دل ہر غمی و خوشی، ہر دکھ و تکلیف پر طمانیت کا اظہار کرتا ہے۔ کسی طرح کی پریشانی انہیں لاحق نہیں ہوتی کہ جو اُن کے لیے وبالِ جان بنے۔ اسی طرح ہر فردِ معاشرہ کی چار و ناچار اوّلین کوشش یہی ہوتی ہے کہ اُسے اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔ عصر حاضر کی سب سے بڑی پریشانی قلبی اضطراب، بے اطمینانی اور بے سکونی ہی مشاہدہ میں آتی ہے کہ جس نے آبادی کی اکثریت کو ڈپریشن جیسے مرض میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ لہٰذا! لا محالہ ایسے تریاق کی ضرورت ہر لمحہ موجود رہتی ہے جو طمانیت کے حصول میں مدد و معاون ثابت ہو۔

عقیدہ توحید کے دیگر نفسیاتی اثرات میں سے ایک یہ اثر بھی ہے کہ اس پر کامل یقین ہونے سے انسان کے باطن میں طمانیت آتی ہے۔ طبیعت میں ٹھہراؤ آتا ہے۔ ذہنی طور پر انسان حالتِ سکون میں رہتا ہے کیونکہ خالقِ انس و جن نے قرآن میں بجا فرمایا ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ [20]

وہ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں، سن لو اللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے۔

عمومی طور پر قلب سے انسانی وجود میں گوشت کے ایک لوتھڑے کو جسے "دل" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے مراد لیا جاتا ہے لیکن دورِ جدید میں طبی سائنس مختلف تجربات کی صورت میں ثابت کر چکی ہے اُس دل کا کام صرف خون کو گردش میں رکھنا ہے جس سے ابہام پیدا ہوتا ہے کہ اگر صرف خون کو گردش میں رکھنا ہی دل کا کام ہے تو قرآن میں اِسے اطمینان کے لیے مرکزی مقام کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دکھ و تکلیف، الجھن و پریشانی میں انسان بلند یا پست فشارِ خون جیسے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے انسانی طبیعت ہر لمحہ مختلف کیفیات میں محور رہتی ہے، جو کبھی بھی اطمینانِ قلب کا باعث نہیں بنتی، لہٰذا اگر گوشت کا یہ لوتھڑا حالتِ سکون میں رہے گا تو مجموعی طور پر انسان بھی پُر سکون ہو گا۔ اس لیے ذہنی حالتوں کو مرتکز رکھنے کے لیے "ذکرُ اللہ" ضروری عمل ہے تاکہ سوچ کے بحرِ بے کنار کو قرار آ سکے اور انسان فشارِ خون کے مرض سے محفوظ رہ سکے جس کے سبب وہ دیگر امور بہتر طور پر سر انجام دے سکے گا جن میں سے ایک "یادِ الٰہی" بھی ہے۔ کیونکہ انسان کبھی بھی ایک جیسی کیفیت پر ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا، مختلف اوقات

میں متضاد کیفیتیں اُس پر وارد ہوتی رہتی ہیں لہٰذا محور و مرکز کی طرف رجوع از حد ضروری امر ہے تاکہ طمانیت حاصل ہو سکے۔ مندرجہ ذیل میں لفظ "قلب" قرآن مجید میں کن کن معنوں میں مستعمل ہوا ہے، اُن کا سرسری سا تذکرہ کیا گیا ہے:

- قلب بمعنی فہم و ادراک: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ۔[21] یعنی بیشک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جو دل رکھتا ہو۔
- قلب بمعنی روح و جان: وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ۔[22] کہ جبکہ ٹھٹک کر رہ گئیں نگاہیں اور دل گلوں کے پاس آ گئے۔
- قلب بمعنی نرمی و مہربانی: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ[23] کہ تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب! تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہو جاتے۔

مندرجہ بالا و دیگر اِس موضوع پر آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انسانی وجود میں قلب ہی ہر قسم کے معمولات و محرّکات کا محور و مرکز ہے، اِسی کے بے چین ہونے سے انسان اضطرابی کیفیات میں مبتلا ہوتا ہے اور اِسی کو تسکین ملنے سے طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

## چہارم: شجاعت و بہادری

شجاعت و بہادری، افراد و اقوام کا طرّہ امتیاز ہوتی ہے۔ جس قوم کے افراد جس قدر جنگجو ہوں گے، دیگر اقوام کی نسبت اُنہیں اتنا ہی زیادہ جراتمند اور بہادر گردانا جاتا ہے۔ لیکن لازم نہیں کہ اُن کی یہ صلاحیت معاشرے کے لیے اجتماعی سطح پر فلاح و بہبود کا ذریعہ بھی بنے۔ ممکنات میں سے ہے کہ وہ کسی بغض و عناد کی بنیاد پر دوسری بستیوں پر حملہ آور ہوں اور اُنہیں تباہ برباد کر دیں یا یہ سارا معاملہ محض لوٹ مار کے لیے رچایا جائے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر جنگ و جدل میں شجاعت و بہادری کا وہ کونسا پہلو ہے جس میں فلاح و اصلاح بھی پنہاں ہو اور فساد بھی پیدا نہ ہو بلکہ یہ عمل ردّ فساد میں معاون ثابت ہو؟ جبکہ دوسری طرف مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اِس محاذ آرائی میں مذہب کو بھی بعض ادوار میں بطور ہتھیار استعمال ہوتے انسانی تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح مذہب کے نام پر آپس میں جنگوں کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ ایسے مواقع پر دیگر مذاہب کے متبعین کی طرف سے اختیار کئے گئے لائحہ عمل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اسلام کی بات کی جائے تو یہاں جانچنے و پرکھنے کے لیے سیرتِ مصطفیٰ ﷺ سیرت و مغازی کی صورت میں دستیاب ہے، جس کی روشنی میں اعمالِ مسلمانانِ اسلام کا جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ اُن کا کونسا عمل راہِ خدا میں کئے گئے جہاد سے تعبیر ہوتا ہے اور کون کون سے عوامل ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے سرانجام دیئے گئے۔

اسلامی تعلیمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شجاعت و بہادری، جسمانی و افرادی قوت کی دستیابی پر منحصر نہیں بلکہ خدائے برحق کے حکم میں پنہاں ہے۔ اگر جسمانی قوت، بہادری کا طرّہ ہائے امتیاز ہوتی تو میدان جنگ میں صرف پہلوان نما لوگ ہی شمولیت اختیار کر پاتے جو کہ خلاف عقل و نقل بھی ہے۔ اِسی طرح اگر افرادی قوت ہی شجاعت کی علمبردار ہوتی تو تاریخ انسانی میں بڑے بڑے گروہوں کی فتوحات کا تذکرہ ہی ملتا جبکہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ[24]

بارہا کم جماعت غالب آئی ہے زیادہ گروہ پر اللہ کے حکم سے۔

تعلیمات اسلامیہ میں لفظ "جہاد" جنگ و جدل کے بالمقابل استعمال کیا جاتا ہے جو کہ منفرد پس منظر کا حامل ہے۔ یہاں جہاد سے "فساد فی الارض" ہرگز مراد نہیں لیا جاتا، بلکہ اصلاح احوال کے زُمرے میں مستعمل ہے۔ اصطلاحی معنٰی کے لحاظ سے یہ لفظ اپنے

دامن میں وسعتوں کا بحرِ بے کنار سموئے ہوئے ہے۔ انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعیت تک اور انسانی شخصیت کے باطنی امور سے لے ظاہری تعاملات تک سبھی پہلو اس کے دائرہ گفتار میں گردانے جاتے ہیں۔ قرآن میں کہیں اس عمل سے ردُّ الفساد کا معنی مراد لیا گیا ہے جیسا کہ:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ [25]

اور اگر اللہ لوگوں میں بعض سے بعض کو دفع نہ کرے تو ضرور زمین تباہ ہو جائے۔

کہیں عمل جہاد کو "حفظ و امان" برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا [26]

اللہ اگر آدمیوں میں ایک کو دوسرے سے دفع نہ فرماتا تو ضرور ڈھادی جاتیں خانقاہیں اور گرجا اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت نام لیا جاتا ہے۔

ایک اور مقام پر جہاد سے "شخصی جدوجہد" مراد لیا گیا ہے جس کا اظہار مندرجہ ذیل آیت سے ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[27]

اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ضرور ہم انہیں اپنے راستے دکھادیں گے۔

قرآن حکیم میں لفظ جہاد کے متبادل الفاظ "حرب" اور "قتال" بھی مختلف پس منظر میں استعمال کئے گئے ہیں جن کا مجموعی طور مطالعہ کیا جائے تو قاری پر واضح ہوتا ہے کہ یہ واحد فعل ہے جو انسان کو جہد مسلسل پر اکسائے رکھتا ہے۔ اِسی سے فساد فی الارض کی سرکوبی ممکن ہے اور اسی کے سبب اصلاحِ احوال کا رستہ کھلا رہتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو سبھی انبیاء کرام علیہم السلام نے تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ ہر ممکن سطح پر سرانجام دیا ہے۔ الغرض! انسان، شجاعت و بہادری کی فقید المثال قائم کر سکتا ہے مگر اس بے مثل عمل کا انحصار فکر و ذکر کے ثبات پر ہے۔ عقائد ایمانیہ کی پختگی، عملِ جہاد کی بنیاد ہے جس کی بنا پر جرات و ہمت کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْف[28]

اے نبی! مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو اگر تم میں کے بیس صبر والے ہوں گے دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں کے سو ہوں تو کافروں کے ہزار پر غالب آئیں گے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کے وجود میں شجاعت و بہادری کے خصائص پیدا کرنے میں مذہب کو کلیدی کردار حاصل ہے اور مذہب ہی عزم و حوصلہ کو استحکام بخشتا ہے۔ عددی اکثریت و اقلیت بھی تبھی مفید ہوگی جب مبلغِ دین کا کردار عملی صورت میں ثابت قدم ہوگا، جو تصوّرِ الٰہی کو مخاطبین کے قلوب میں راسخ کر سکے۔

## پنجم: عالمگیریت یا آفاقیت

کل انسان چونکہ ابنِ آدم ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے تخلیق کئے گئے تھے لہٰذا سبھی انسانوں میں فطری طور پر کئی مشترکات ہوں گے جو دنیا کے کسی بھی کونے پر بسنے والے آدم زاد میں موجود ہوتے ہیں، مثلاً اُن کی ظاہری ساخت ایک جیسی ہوگی، اُن میں ایمانداری و بے ایمانی، مشقت و سہل پسندی، شفقت و سنگدلی و دیگر اقدار بلا شرکتِ مذہب، کم و بیش یکساں پائی جائیں گی۔ کہیں اچھائی غالب ہوتی دکھائی دے گی تو کہیں اِس کے برعکس وقوع پذیر ہو رہا ہوگا۔ الغرض! جنہیں عالمگیر یا آفاقی اقدار میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ انسان

کے جذبے اور جبلتیں عموماً ایک جیسی ہیں چنانچہ ایسی اقدار جو مقامیت کی قید میں اسیر ہو کر ایک خاص حصے، طبقے یا گروہ کی شناخت بن جاتی ہیں، اُنہیں آفاقی نہیں کہا جاسکتا مثلاً رنگ، لباس، رہن سہن و دیگر وغیرہ۔ ایسی اقدار سے انسانوں کا ایک خاص طبقہ تو مستفیض ہو سکتا ہے لیکن کُل نوعِ انسانی اُن کے پیشِ نظر نہیں ہو سکتی۔ آفاقی اقدار ایک منفرد پہلو رکھتی ہیں۔ ہر آفاقی قدر مقامی حیثیت اختیار کر سکتی ہے لیکن ہر مقامی قدر آفاقی نہیں بن سکتی۔ یہاں آفاقی اقدار یا آفاقیت سے مراد ایسی اقدار ہیں جو زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہوں یعنی جس میں وقت اور جگہ کا تعین نہ ہو۔

تقریباً 1400 سال قبل سبھی مذاہب مقامی اقدار کے متحمل تھے۔ ایک خاص علاقے، خطے اور نسل کی فلاح و اصلاح سے اُن کی تعلیمات کا تعلق تھا جن پر عالمگیریت یا آفاقیت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرز پر انسانی تہذیب بھی ترقی پاتی رہی۔ کئی تہذیبیں منصہ شہود پر آئیں اور کئی صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ لیکن دائم استحکام کسی کو نصیب نہیں ہو سکا، کیونکہ مذاہب میں تحریفات نے راہ پکڑ لی تھی جس نے اختراعات کو جنم دیا جو بعد ازاں مرگِ مفاجات کا سبب بنا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ[29]

اللہ کی باتوں کو اُن کے ٹھکانوں سے بدلتے ہیں اور بھلا بیٹھے بڑا حصہ ان نصیحتوں کا جو انہیں دی گئیں۔

اسلام، آفاقیت کا علمبردار ہے۔ عصر حاضر میں یہی واحد دین ہے جس کی بنیاد رنگ و نسل، آباؤ اجداد، علاقہ و خطہ یا کسی بھی دنیوی تفاخر پر نہیں ہے۔ اِس کے اصول و ضوابط سبھی انسانوں کے لیے یکساں افادیت کے متحمل ہیں۔ اِس میں آفاقیت کے قواعد منفرد ہیں۔ یہاں مال و متاع کی بجائے تقویٰ کو فوقیت حاصل ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ[30]

بیشک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔

جبکہ علامہ اقبال رحمہ اللہ تمام مسلمانانِ اسلام کو ایک ہی لڑی میں پروتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے　　　اسلام تیرا دیس ہے اور تو مصطفوی (ﷺ) ہے[31]

مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہوا کہ اسلامی تعلیمات کی بنیاد دنیوی لحاظ سے اختراع شدہ اصول و قواعد سے مبرّا اور الگ و تھلگ ضوابط پر قائم کی گئی ہے جس کے لیے "تقویٰ" کو اساسی قدر کی اہمیت حاصل ہے۔ جبکہ !تقویٰ، کیفیات قلبی میں سے ایک کیفیت ہے۔ اِسے ظاہری پیمانوں سے جانچا و پرکھا نہیں جا سکتا۔ یہ میدانِ کارزار میں ہی واضح ہوتی ہے جس کے لیے جگہ اور وقت کا تعیّن ممکن نہیں۔ اسلام نے شاید تقویٰ کو تکریم و فضیلت کی اساس اِسی لیے قرار دیا ہے کیونکہ یہ فرد کے ظاہر و باطن سے یکسو ہو کر سرزد ہونے والا عمل ہے جس کے لیے کسی دوسرے کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ تقویٰ کے زیرِ سایہ وقوع ہونے والا ہر فعل حقیقتاً اپنی اساس اور قدر کا مظہر ہوتا ہے جنہیں صرف باری تعالیٰ ہی جان سکتا ہے جبکہ دیگر از کارِ نیست۔

اسلام کا آفاقی دین ہونا، ایک کثیر الجہتی موضوع ہے جس میں عقائد، عبادات و معاملات اور معاشرت کے ساتھ ساتھ دیگر کئی پہلو زیرِ بحث آتے ہیں لیکن بطورِ نفسِ مضمون، اسلام کے بارے میں قرآن مجید میں کیا ارشاد فرمایا گیا ہے اُس سے آگاہ ہونا بھی قاری کے لیے از حد ضروری ہے۔ اسلام کے متعلق قرآنِ حکیم میں ذکر ہے کہ:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ[32]

بیشک اللہ کے یہاں اسلام ہی دین ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ[33]

اور جو اسلام کے سوا کوئی دین چاہے گا وہ ہر گز اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔

مذکورہ بالا آیات سے اسلام کی آفاقیت واضح ہوتی ہے کہ عقیدہ توحید و رسالت، تبھی اپنے ثمرات سے مستفید کر سکتے ہیں اگر اسلام کو دین کے طور پر اختیار کر لیا جائے۔ اس میں لیت و لعل سے کام لینا نرے خسارے کا سودا ہے کیونکہ اسلام سبھی انسانوں کے لیے یکساں ہدایت لے کر آیا ہے۔ اس میں رنگ و نسل، حسب و نسب اور رُتبے و مرتبے جیسے تاثرات کا قلع و قمع کر کے صرف تقویٰ کو فوقیت دی گئی ہے جیسا کہ سابقہ بحث میں مذکور ہے اور دین اسلام کی تعلیمات تمام انسانوں کے لیے ہمہ وقت ہدایت و رہنمائی کا برملا اعلان کرتی نظر آتی ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہو رہا ہے:

أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ [34]

جس میں قرآن اُترا لوگوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں۔

آیاتِ مذکورہ سے واضح ہو رہا ہے کہ اسلام ہی تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے آفاقی دین ہے کیونکہ اِس کی تعلیمات حیاتِ انسانی کے سبھی پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، جو نہ صرف عقائد کی تشریحات بیان کرتی ہیں بلکہ عبادات، معاملات اور معاشرت کے حوالے سے بھی تفصیلات کا ضخیم ذخیرہ اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں جن کا سرسری سا تذکرہ آئندہ کی عبارات میں مندرج ہے۔

## عبادات

عبادات کو عمومی طور پر تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1. **قولی عبادات:** قولی عبادات میں وہ سب ذکر و اذکار شامل کئے جا سکتے ہیں جو سرّی و جہری وظائف پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جنہیں صرف زبان سے ادا کرنا ہوتا ہے جیسا کہ تسبیحات وغیرہ۔

   يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا۔ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا [35]

   اے ایمان والو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بولو۔

2. **بدنی عبادات:** نماز، حج اور روزہ بدنی عبادات میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہ ایسی عبادات ہیں جو ہر مسلمان پر استطاعت کے مطابق فرض ہیں۔ نماز، صاحب شعور پر دن میں پانچ بار، اِسی طرح حج مالی طور پر استطاعت رکھنے والے پر زندگی بھر میں ایک بار اور روزہ، صحتمند و مقامی فرد پر سال بھر میں ایک بار فرض کئے گئے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

   وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ [36]

   اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

   حج کے بارے میں ذکر ہے کہ:

   وَلِلّٰهِ عَلَي النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا [37]

   اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو اس تک چل سکے۔

   روزہ کے متعلق قرآن مجید میں ذکر ہے کہ:

   كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ [38]

   تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے اگلوں پر فرض ہوئے تھے۔

3. **مالی عبادات:** زکوٰۃ، صدقات، خیرات و دیگر اُمور مالی عبادات میں شامل کئے جاتے ہیں۔ مال! انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتِ خاص کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہی مال انسان کے لیے فلاح و کامیابی کا سبب بنتا ہے اور اسی کے سبب "مالِ مفت، دلِ بے

رحم" کے زُمرے میں انسان ضلالت و جہالت کی طرف سرپٹ دوڑتا چلا جاتا ہے۔ مسلمان کو جس طرح قولی و بدنی عبادات کا حکم دیا گیا ہے اُسی طرح اپنے مال سے بھی خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً [39]

وہ جو اپنے مال خیرات کرتے ہیں رات میں اور دن میں چھپے اور ظاہر۔

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ سے واضح ہوتا ہے کہ عبادات نے انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو کو اپنے احاطہ میں لیا ہوا ہے۔ چاہے اُن کا تعلق زبان سے ہو، جسمانی مشقت سے ہو یا عطاء کردہ مال سے ہو، سبھی گوشوں پر کامل رہنمائی عملی صورت میں موجود ہے۔ اِسی طرح معاملات کے حوالے سے بھی اسلام، تمام انسانوں کے لیے یکساں ہدایات جاری کرتا ہے کہ اپنی معاملات میں کس طرح کا رویہّ اختیار کرنا چاہئے اور کسی بھی قسم کا لین دین کرنے سے پہلے کیا کیا احتیاطی تدابیر اپنانی چاہئیں۔ یہاں پر بھی معاملات کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جیسا کہ:

1. **تقریری معاملات:** تقریری معاملات میں وہ سبھی معاہدات شامل کئے جا سکتے ہیں جو افرادِ معاشرہ باہمی گفت وشنید کے ذریعے طے کرتے ہیں جیسا کہ کسی قسم کا عہد و پیمان کرنا۔ ایسے معاملات کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا [40]

اور عہد پورا کرو بیشک عہد کے بارے میں سوال ہونا ہے۔

2. **تحریری معاملات:** تقریری معاملات کے ساتھ ساتھ اسلام تحریری معاملات کے بارے میں بھی رہنماء اصول وضع کرتا ہے جیسا کہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ [41]

مومنو! جب تم ایک مقرر مدت تک کسی دین کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو اور چاہیے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا ٹھیک لکھے۔

مذکورہ بالا آیت میں "مقررہ مدت" کی قید واضح ہو رہی ہے کہ جب کوئی لین دین کرنے لگیں تو تحریری صورت میں کیا کریں جبکہ اِسی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر باہمی تجارت کا معاملہ فوری خریداری کی صورت میں ہو تو ایسے معاملات کو مرقوم کرنا ضروری نہیں ہے جیسا کہ:

اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا [42]

مگر یہ کہ کوئی سر دست کا سودا دست بدست ہو تو اس کے نہ لکھنے کا تم پر گناہ نہیں۔

مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں باہمی معاملات کی تنظیم و تشکیل کی جائے تو معاشرہ میں اتحاد و اتفاق کا عنُصر نمایاں ہونے لگتا ہے جو حسنِ معاشرت کا اوّلین جزو ہے۔ معاشرت ! رہن و سہن نہ صرف علاقائی ثقافت کا مظہر ہوتی ہے بلکہ مذہبی تعلیمات کی بھی امین ہوتی ہے کیونکہ ثقافت تاریخی ادوار کے اتار و چڑھاؤ سے منسلک ہو سکتی ہے جبکہ مذہب کی بنیادی تعلیمات دائم ہوتی ہیں جن کے زیرِ سایہ ثقافت پنپتی ہے۔ علاقوں کے لحاظ سے ثقافتی رسوم و رواج میں تبدیلی فطری عمل ہے جبکہ مذہب کے اصول و قواعد مخاطبینِ مذہب کے لیے یکساں نافذ العمل ہوں گے۔

اسلام نے جس طرح دیگر کئی امورِ زندگی کو تفصیل سے بیان کیا ہے اُسی طرح معاشرت کے بھی قواعد و ضوابط وضع کئے ہیں جن سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام کس قدر انسانی اقدار کو اہمیت دیتا ہے کیونکہ اِنہی اقدار کی بنا پر ایسا معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس میں محبت

واخوت، ہمدردی ورحمدلی اور ایثاروقربانی جیسے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور بغض وحسد، نفرت وکینہ اور سنگدلی ودشمنی جیسے اشتعال انگیز محرّکات کی بیخ کنی ہوتی ہے۔

حسنِ معاشرت میں اوّلین فوقیت باہمی گفتگو میں فریقین کا ایک دوسرے کو بہترین ناموں سے پکارنے کو دی جاتی ہے کہ جب دوافراد آپس میں کلام کرنے لگیں تو قبل از کلام عمدہ الفاظ سے مخاطب کیا جائے جیسا کہ اسلام نے ملاقات کا طریقہ وضع کیا ہے کہ:

وَاِذَاحُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا [43]

اور جب تمہیں کوئی کسی لفظ سے سلام کرے تو اس سے بہتر لفظ جواب میں کہو یاوہی کہہ دو۔

کلام کا دوسرا پہلو بہترین نام سے مخاطب کرنا ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں حکم ہے کہ:

وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ [44]

آپس میں طعنہ نہ کرو اور ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھو کیا ہی برا نام ہے مسلمان ہو کر فاسق کہلانا۔

افراد کا آپسی میل وجول ایک دوسرے کی خبر گیری کرنے میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ ایک دوسرے کے حالات وواقعات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے معاشرہ باہم ایک لڑی میں جڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھار طبقاتی اختلاف دلوں میں کدورت جیسے واہمات کو جنم دینے کا سبب بن جاتا ہے جو رفتہ رفتہ حسد وکینہ کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔ امیر، معاشرے کے غریب سے صرفِ نظر کرنے اور غریب فرد، امیر کی دولت کے حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے جو تعلقات میں دراڑ اور خیالات میں بغض لاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی تمام تر توجہ آپسی تعلقات کو بحال رکھنے پر مرکوز ہے کیونکہ سماج میں مختلف رنگ ونسل اور اقوام کے موجود ہونے کا مقصد قرآن خود بیان فرماتا ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا [45]

لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو۔

اس لیے مسلمانوں کو قبائلی نسبت کی بنا پر دیگر اہلِ اسلام کا تمسخر اُڑانے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ [46]

اے ایمان والو نہ مرد مردوں سے ہنسیں، عجب نہیں کہ وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں۔

جبکہ افرادِ معاشرہ کے آپسی تعلقات کی بنیاد مندرجہ ذیل آیت میں واضح کی گئی ہے:

يٰۤاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوااجْتَنِبُوْاكَثِيْرًامِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَاتَجَسَّسُوْاوَلَايَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا [47]

مومنو! بہت گمانوں سے بچو بیشک کوئی گمان گناہ ہو جاتا ہے اور عیب نہ ڈھونڈو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔

جب معاشرہ اتحاد واتفاق کی لڑی میں پرویا ہو گا تو وہ دوسرے معاشروں اور اقوام کے لیے مثالی معاشرہ کی صورت اختیار کر جائے گا۔ اِس کے اثرات، قریب ودور میں بسنے والی دیگر قوموں کے ساتھ تعلقات پر بھی پڑیں گے جس سے مختلف فکر ونظر رکھنے والے طبقات کے درمیان یگانگت کا منظر عیاں ہو گا جو اچھائی کو غالب اور برائی کو مغلوب کر دے گا۔ اس لیے اسلام نے دوسرے معاشرتی گروہوں سے مشترک مفادات ہونے کے باوجود احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے جیسا کہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ [48]

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لو کہ کہیں کسی قوم کو بے جا ایذاء نہ دے بیٹھو

پھر اپنے کیے پر پچھتاتے رہ جاؤ۔

اسلام، اپنے ماننے والوں کو اخوت کے رشتے میں باندھتے ہوئے حکم دیتا ہے اگر کہیں اُن میں اختلاف پیدا ہو جائے جو نزاع کا سبب بنے اور مسلمانوں کے شیرازے کو بکھیرنے کی کوشش کرنے لگے تو اُن کی صلح کروا دو تاکہ جسدِ واحد کی طرح آپس میں مل جُل کر رہیں۔ ارشاد ہے کہ:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ [49]

مسلمان مسلمان بھائی ہیں تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کراؤ۔

مذکورہ بالا مباحث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام ہی آفاقیت کا علمبردار ہے کیونکہ اسلام! انسانی فکر کے تمام مراحل سے لے عمل کے سبھی کرداروں کو تجرباتی انداز میں تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ عقائد، عبادات، معاملات اور معاشرت کے بارے میں ہر ضمنی بحث کو منفرد اور قابل اتباع صورت میں زیر قلم لا کر سبھی انسانوں کے لیے فلاح و اصلاح کا راستہ متعیّن کر دیا ہے، جو چاہے کامیابی سمیٹ لے اور جو چاہے ناکام و نامراد ٹھہرے۔

## ششم: متوازن شخصیت

معتدل، متوازن اور تحمل مزاج شخصیت کا حامل فرد عصر حاضر کی اہم ترین ضرورت ہے۔ انفرادی، گھریلو، سماجی اور ثقافتی سطح پر غیر اعتدالی اس قدر عام ہو چکی ہے کہ انسانیت کا تشخص مسخ ہوتا جا رہا ہے۔ اخلاقیات، طاق نسیاں کا حصہ بنتی جا رہی ہیں اور تنفر و متعصّب مزاجی معمولِ عام ہوتی جا رہی ہے حتیٰ کہ عصری علوم کی عموماً اور نفسیاتی علوم کی خصوصاً جو سب سے اہم بحث ہے وہ انسان کی شخصیت سازی کے بارے میں ہے کہ کس طرح ایسا فرد تیار کیا جائے جو انفرادی و اجتماعی لحاظ سے کامل ہو، لیکن تحقیقاتی مباحث کبھی اُس کے ظاہری وجود کو مضبوط بنانے پر توجہ مرکوز کرتی ہیں اور کبھی صرف باطنیت کو ہی حرف آخر گردانے لگتی ہیں۔

دونوں عوامل سے منزل مقصود کا حصول ممکنات میں سے نہیں ہو پا رہا کیونکہ وجود پرستی صرف ظاہری چال ڈھال کو سنوارنے پر لگی رہتی ہے، جبکہ باطن خالی رہ جاتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان دِکھنے میں خوبصورت نظر آتا ہے لیکن آپسی معاملات بعض اوقات دگرگوں حالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یوگا، رہبانیت و دیگر اِسی قبیل کے تعاملات اختیار کرتے ہوئے صرف باطن کی اصلاح پر توجہ مرکوز رکھنے سے ظاہری معاملات بگاڑ کے زُمرے میں آنے لگتے ہیں لیکن مجموعی لحاظ سے مطلوبہ کامل شخصیت حاصل نہیں ہو پاتی۔

مذکورہ بالا دونوں پہلوؤں کو یکجاں کرنا ہی کامیابی کی ضمانت بن سکتا ہے لیکن اصول عام کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس طرح ہر شے کو شکل و صورت دینے کے لیے ایک تمثیلی ڈھانچہ کا ہونا لازم تصور کیا جاتا ہے اِسی طرح شخصیت سازی کے لیے بھی "اسوہ کامل" کا موجود ہونا از حد ضروری ہے جس کو مدِّ نظر رکھ کر شخصیت سازی کے مراحل کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔ دورِ جدید کے نقلی و عقلی علوم میں ایسے کسی "کامل کردار" کا وجود دستیاب ہونا ممکن نہیں دِکھتا۔ لا محالہ تاریخ انسانی کی اوراق گردانی کی جائے تو اسلام کا دامن ایسے قواعد و ضوابط سے بھرا ہوا نظر آتا ہے جن میں بیان کئے گئے خطوط پر انسان کو استوار کر کے مطلوبہ اہداف کا حصول ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

لہٰذا اسلامی تعلیمات، انسانی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کی اتم صلاحیت رکھتی ہیں۔ باہمی معاملات میں معتدل مزاج انسان ہی اسلامی تعلیمات کا مطلوب و مقصود ہے۔ اکھڑ مزاج، جھگڑالو اور بدزبان قسم کا انسان اسلام کی نگاہ میں عیب دار شخصیت کا مالک ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ [50]

اور بعض آدمی وہ ہیں کہ دنیا کی زندگی میں اس کی بات تجھے بھلی لگے اور اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ لائے اور وہ سب سے بڑا جھگڑالو ہے۔

ایسے شخص کی خصلتوں کا ذکر قرآن مجید میں ہی بیان فرمادیا گیا ہے کہ وہ زمین میں دنگا فساد برپا کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے واضح ہوتا ہے:

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ [51]

اور جب پیٹھ پھیرے تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے اور کھیتی اور جانیں تباہ کرے۔

جبکہ اتباع "اسوہ کامل" میں زندگی گزارنے والوں کی خاصیت بیان کی گئی ہے کہ وہ آپس میں ایثار و محبت سے رہنے والے ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ [52]

محمد اللہ کے رسول ہیں، اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل۔

مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں تربیت پانے والے افراد کے خصائص قرآن مجید میں جابجا بیان فرمائے گئے ہیں جن کا سرسری سا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں مرحلہ وار کیا گیا ہے:

## آدابِ گفتگو

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ [53]

اور میرے بندوں سے فرماؤ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ [54]

اور میانہ چال چل اور اپنی آواز کچھ پست کر بیشک سب آوازوں میں بری آواز، آواز گدھے کی۔

## چال وڈھال

متکبرانہ انداز اختیار کرنے سے منع فرمایا گیا ہے کہ تکبر کرنے سے اپنا نقصان ہی بڑھایا جارہا ہے جیسا ارشاد باری ہے:

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا [55]

اور زمین میں اتراتا نہ چل بیشک ہر گز زمین نہ چیر ڈالے گا، اور ہر گز بلندی میں پہاڑوں کو نہ پہنچے گا۔

جبکہ قرآن مجید میں ایسے افراد کا چلنا منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اطاعت رسول اللہ ﷺ میں زندگی گزارنے کی خود کو عادت ڈالی ہوتی ہے، جس کا اظہار مندرجہ ذیل آیت سے ہوتا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَي الْاَرْضِ هَوْنًا [56]

اور رحمٰن کے وہ بندے کہ زمین پر آہستہ چلتے ہیں۔

## وہم و گمان اور ظن نہ کرنے کا حکم

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـــُٔوْلًا [57]

اور اس بات کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہونا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا [58]

مومنو! بہت گمانوں سے بچو بیشک کوئی گمان گناہ ہو جاتا ہے اور عیب نہ ڈھونڈو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔

## تمسخر اور ٹھٹھا کرنے کی ممانعت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاۗءٌ مِّنْ نِّسَاۗءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ[59]

مومنو! نہ مرد مردوں سے ہنسیں عجب نہیں کہ وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے، دور نہیں کہ وہ ان ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں اور آپس میں طعنہ نہ کرو اور ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھو۔

## اجازت لینے کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْ[60]

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں نہ جاؤ جب تک اجازت نہ لے لو۔

یہاں سے معاشرے میں بے حیائی پھیلنے کے بنیادی اسباب پر پہرہ بٹھانے کے لیے کچھ احکام دیے جا رہے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ کسی دوسرے کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ کسی دوسرے کے گھر میں بے جا مداخلت نہ ہو جس سے اسے تکلیف پہنچے۔ دوسرے بلا اجازت کسی کے گھر میں چلے جانے سے بے حیائی کو بھی فروغ مل سکتا ہے اور اجازت لینے کا طریقہ بھی یہ بتایا گیا ہے کہ باہر سے السلام علیکم کہا جائے یا اگر یہ خیال ہو کہ گھر والا سلام نہیں سن سکے گا اور اجازت دستک دے کر یا گھنٹی بجا کر لی جا رہی ہے تو جب گھر والا سامنے آجائے اس وقت اسے سلام کیا جائے۔

## حسنِ سلوک کی ترغیب

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًاوَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰي وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِالْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙوَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ[61]

اور ماں باپ سے بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پاس کے ہمسائے اور دور کے ہمسائے اور کروٹ کے ساتھی اور راہ گیر اور اپنی باندی غلام سے۔

## خود نمائی کی ممانعت

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ[62]

تو آپ اپنی جانوں کو ستھرا نہ بتاؤ۔

## عہد و پیمان کی اہمیت

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚاِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا[63]

اور عہد پورا کرو بیشک عہد سے سوال ہونا ہے۔

## مال ناحق لینے کی ممانعت

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ[64]

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق)۔

مندرجہ بالا چنیدہ اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ شخصیت سازی میں انفرادی و اجتماعی سطح پر بنیادی کردار ادا کرنے والے سبھی پہلوؤں کو مفصّل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ الغرض! عصرِ جدید میں جس بھی طرز پر انسان کی فلاح و اصلاح درکار ہو اسلامی تعلیمات، اُن تمام ضمیمات پر قولی و عملی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔

## ہفتم: دائمی پن کا حصول

کتبِ تاریخ و سیرۃ کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ مداومت، دوام، استمرار خاصہ خاصانِ رُسُل علیہم السلام کو اتباعِ سنت کے سبب ہی حاصل رہا ہے۔ تنزّلی، پستی اور اسبابِ زوال سے انسان ہمیشہ خائف نظر آتا ہے لیکن مشاہدہ کائنات شاہد ہے کہ:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ[65]

ہر جان کو موت چکھنی ہے۔

موت، وفات، انتقال جیسے الفاظ سے ظاہر ہے کہ انسان کو دائمیت کا حصول ممکن نہیں کیونکہ خالقِ انساں کا واضح پیغام ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا[66]

اور کوئی جان بے حکم خدا مر نہیں سکتی سب کا وقت لکھا رکھا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ذی روح کو زوال ہے، موت ہے، اِس دنیا سے ہجرت چاروناچار لازم امر ہے لیکن اِن سب کے باوجود ازل سے انسان کی نفسانی خواہشات میں خود کی ذات کو دوام بخشنے جیسا عزم مقاصدِ اوّلین میں شامل رہا ہے۔ یہ آرزو انسانی ذہن میں بارہا انگڑائیاں لیتی رہتی ہے کہ کسی سبب تنزّلی کا سفر تھم جائے۔ ڈھلتی عمر رُک جائے۔ شباب، دائم قائم رہے اور دیکھتی آنکھوں کا جہاں سدا شادو آباد رہے۔ جس کے لیے عصرِ جدید میں بھی بارہا جتن کئے جا رہے ہیں۔ اِسی حرص کا ذکر قرآن نے بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ[67]

اور بیشک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں اور مشرکوں سے ایک کو تمنا ہے کہ کہیں ہزار برس جیئے۔

جبکہ حقیقتِ حال بھی قرآن ہی ذکر فرماتا ہے کہ:

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِم[68]

اور ہر گز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے ان بداعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے۔

لیکن کامیابی کا حصول ممکن نہیں ہو پایا جبکہ اسلام اپنے متبعین کے لیے بعد از مرگ حیات جسے عقیدہ آخرت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے کے ذریعے دنیوی اعمال کو ہمیشہ قائم و دائم رکھنے کی عملی صورت پیش کرتا ہے کہ جب "مثقال ذرۃ" بھی انسان سے پنہاں نہیں رکھا جائے گا۔ عدل و احتساب کا دور دورہ ہو گا۔ عقائد اسلامیہ کی یہی اہم خصوصیت ہے کہ وہ نہ صرف دنیوی زندگی کو احسن طریقے سے گزارنے کے لیے رہنماء اصول مہیّا کرتے ہیں بلکہ اخروی حیات کے لیے بھی ذخیرہ اندوزی کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں جیسا کہ آیاتِ قرآنیہ میں مذکور ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ[69]

وہ جو اپنے مال خیرات کرتے ہیں رات میں اور دن میں چھپے اور ظاہر ان کے لیے ان کا اجر (انعام، حصہ) ہے ان کے رب کے پاس۔

دائمیت، صرف اسلام کی اتباع میں پوشیدہ ہے۔ اسلام دونوں جہانوں میں کامیابی کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور دعوتِ عام دیتا ہے کہ ہمیشہ کی زندگی کا حصول صرف اسلام لانے میں ہے۔ جو دنیوی زندگی کو دوام بخشنا چاہتے ہیں اُن سبھی متفکرین کے لیے تعلیماتِ اسلامیہ عملی صورت میں "اسوہ" پیش کرتی ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر دائمی پن کا حصول ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

عمومی طور پر یہی تصوّر پایا جاتا ہے کہ انسان پر موت کا حکم نافذ ہونے کے بعد اعمال نامہ بند ہو جاتا ہے اور یہی اعمال نامہ بروزِ حشر اُس کی جزا و سزا کا تعیّن کرے گا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلَاثَةٌ، فَيَرْجِعُ اثْنَانِ وَيَبْقَى وَاحِدٌ، يَتْبَعُهُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَعَمَلُهُ، فَيَرْجِعُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَيَبْقَى عَمَلُهُ[70]

میت کے پیچھے تین چیزیں جاتی ہیں۔ اُن میں سے دو لوٹ آتی ہیں اور ایک ساتھ رہ جاتی ہے۔ اُس کے پیچھے اُس کے گھر والے، مال اور عمل جاتا ہے۔ اُس کے گھر والے اور مال لوٹ آتے ہیں جبکہ عمل ساتھ رہ جاتا ہے۔

جبکہ اسلام یہاں بھی امید کی ایک کرن جلائے رکھتا ہے کہ فرد کے انتقال کے بعد بھی ایسے اعمال موجود ہیں جن سے اُسے استفادہ ہو سکتا ہے۔ احادیث مبارکہ میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ[71]

جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اُس کا عمل موقوف ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب جاری رہتا ہے: (ایک) صدقہ جاریہ، (دوسرا) علم جس سے لوگ نفع اٹھائیں اور (تیسرا) صالح اولاد جو اُس کے لیے دعاء کرتی رہے۔

مذکورہ بالا احادیث مبارکہ سے واضح ہوا کہ انسان کو دائمی پن کا حصول تبھی ممکن ہے جب یہاں سے احسن اعمال کا ذخیرہ ساتھ لے کر جائے گا اور اپنے پیچھے دائم جاری رہنے والے قابلِ استفادہ محرّکات چھوڑے گا جن سے دیگر افراد ہمیشہ مستفیض ہوتے رہیں اور اس کے لیے اجر و ثواب کا باعث بنتے رہیں جو اُس فرد کا نام اِس دنیا میں بھی زندہ رکھیں اور اگلے جہاں میں جزا کا سبب بھی بنیں۔

## ہشتم: کاملیت

کاملیت، مکمل ہونا، تکمیل کرنا اور ترقی کرنا کے معنوں میں مستعمل ہے۔ انسان جب ذاتِ باری تعالیٰ پر کامل ایمان و ایقان رکھتا ہے تو اُسے اندرونی طور پر خود کی ذات کی تکمیل ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ دنیوی اغراض و مقاصد اُسے ہیچ نظر آنے لگتے ہیں جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی و منشاء کا حصول باقی سبھی معمولات پر سبقت لے جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ مسلمان رہبانیت اختیار کر کے اِس مقام تک رسائی حاصل کر سکتا ہے بلکہ رہبانیت کو اسلام میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ:

قالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَإِنِّي أُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا، وَقَالَ آخَرُ: أَنَا أَصُومُ الدَّهْرَ وَلاَ أُفْطِرُ، وَقَالَ آخَرُ: أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلاَ أَتَزَوَّجُ أَبَدًا، فَجَاءَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَيْهِمْ، فَقَالَ: أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا، أَمَا وَاللَّهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي[72]

ایک نے کہا میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے نے کہا میں نکاح نہیں کروں گا اور عورت سے ہمیشہ الگ رہوں گا، اس کے بعد رسول اللہ (ﷺ) ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کیا تم لوگوں نے یوں یوں کہا ہے؟ اللہ کی قسم! میں اللہ تعالیٰ سے تمہاری بہ نسبت بہت زیادہ ڈرنے والا اور

خوف کھانے والا ہوں، پھر روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور ساتھ ساتھ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، یاد رکھو جو میری سنت سے روگردانی کرے گا، وہ میرے طریقے پر نہیں۔

مذکورہ بالا حدیث مبارکہ واضح کرتی ہے کہ آنحضورِ اکرم ﷺ کے اصحاب نے آپ ﷺ کی سیرت کے اتّباع میں مختلف اُمور کو دائم جاری رکھنے کا ارادہ فرمایا جو کہ اسلام میں رہبانیت کو جاری کرنے کا ذریعہ بن سکتے تھے لیکن آپ ﷺ نے منع فرمایا اور اپنے معمولاتِ زندگی بیان فرما کر واضح کر دیا کہ اُن اُمور کو سرانجام دینا آپ ﷺ کی خوشی کا باعث ہے اور روگردانی کرنے والے کا آپ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں، جس سے رہبانیت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا جبکہ قرآن میں سابقہ اقوام کے اِس رویّے کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا[73]

راہب بننا تو یہ بات انہوں نے دین میں اپنی طرف سے نکالی ہم نے ان پر مقرر نہ کی تھی ہاں یہ بدعت انہوں نے اللہ کی رضا چاہنے کو پیدا کی پھر اسے نہ نباہا جیسا اس کے نباہنے کا حق تھا۔

تکمیل ذات کی علامت انسان کے عملی امور سے واضح ہوتی ہے کہ جب فرد خود کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے تو حدیث مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ میں اسُ کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اُس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے، اُس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔

فَإِذَاأَحْبَبْتُهُ: كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا[74]

پھر جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

مذکورہ بالا نکات عقیدہ توحید کے انسانی نفسیات پر اثرات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ایک معبود کو لائقِ عبادت تسلیم کر لینے سے انسانی افکار و نظریات کیسے توہمات و اختراعات سے پاکیزہ ہو جاتے ہیں۔ عقیدہ توحید کی جامعیت ہر لمحہ انسان کو اپنے حصار میں لیے رکھتی ہے۔ چاہے تنہائی ہو یا محفل، کسی بھی وقت احساسِ نگرانی سے غافل نہیں ہونے دیتی۔

## حاصلِ کلام

کسی بھی مذہب کی بنیاد، اُس کی تعلیمات میں بیان کئے گئے عقائد کی بنا پر جانچی جا سکتی ہے، جن میں اوّلیت عقیدہ معبودیت کو حاصل ہے اور ثانوی درجہ پر داعیِ دین و مذہب کی مبعوثیت ہے، جسے عقیدہ رسالت بھی کہا جاتا ہے۔ یہی دونوں عقائد، باقی سب عقائد پر فوقیت رکھتے ہیں کیونکہ عبادات، معاملات، اجتہادات و دیگر تعاملات سبھی ضمنی مباحث کی اہمیت رکھتے ہیں جب تک کہ عقیدہ توحید و رسالت کا تصوّر، ایمان و ایقان کی حیثیت اختیار نہ کر لے۔ جب یہ تصوّرات متّبعینِ مذہب کے اذہان میں راسخ ہو جاتے ہیں تبھی انسانی نفسیات میں انقلاب آنا شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ایسی ہستی کا تصوّر جو زماں و مکاں کی حدود و قیود سے مبرّا ہو، جو ہمہ وقت و ہمہ اوست، سمع و بصر کر رہا ہو، جسے اونگھ آتی ہو نہ ہی نیند اور جو سب سے بڑھ کر اپنی مخلوق سے محبت فرمانے والا ہو۔ جب انسان کا تعلق اُس ذات سے قائم ہو گا تو انسان کے افکار و نظریات میں لامحالہ وسعت و پختگی، کاملیت و آفاقیت اور دائمیت کے عناصر نمایاں تر ہو جائیں گے جو معاشروں و اقوام کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں گے۔

## حوالہ جات و حواشی

1 سورۃ المائدۃ 3:5۔

2 سورۃ الروم 30:30۔

3 سورۃ النحل 70:16۔

4 سورۃ آل عمران 140:3۔

5 البخاری، محمد بن اسماعیل، **الجامع الصحیح**،(بیروت: دار طوق النجاۃ، 1422ھ)،کتاب الجمعۃ، باب الجمعہ فی القریٰ والمدن، رقم الحدیث: 893۔

6 سورۃ یوسف 76:12۔

7 الترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، **سنن الترمذی**،(مصر: شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، 1975ء)، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقۃ علی العبادۃ، رقم الحدیث: 2682۔

8 سورۃ الحجرات 13:49۔

9 سورۃ البقرۃ 197:2۔

10 الترمذی، **سنن الترمذی**، ابواب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ، باب ومن سورۃ الحجر، رقم الحدیث: 3127۔

11 سورۃ البقرۃ 269:2۔

12 سورۃ النسآء 82:4۔

13 سورۃ البقرۃ 23:2۔

14 سورۃ الزمر 39:62-63۔

15 سورۃ الانعام 95:6۔

16 سورۃ الملک 3:67۔

17 سورۃ الانبیاء 22:21۔

18 سورۃ البقرۃ 255:2۔

19 محمد اقبال، علامہ، **ضرب کلیم**، (اسلام اور مسلمان)، (لاہور: اقبال اکادمی، 1957ء)، ص 33۔

20 سورۃ الرّعد 28:13۔

21 سورۃ ق 37:50۔

22 سورۃ الاحزاب 10:33۔

23 سورۃ آل عمران 159:3۔

24 سورۃ البقرۃ 249:2۔

25 سورۃ آل عمران 251:3۔

26 سورۃ الحج 40:22۔

27 سورۃ العنکبوت 69:29۔

28 سورۃ الانفال 65:8۔

29 سورۃ المآئدہ 13:5۔

30 سورۃ الحجرات 13:49۔

31 محمد اقبال، علامہ، **بانگِ درا**، (علی گڑھ: مکتبہ الفاظ یونیورسٹی مارکیٹ، 1975ء)، ص160۔

32 سورۃ آل عمران 19:3۔

33 سورۃ آل عمران 85:3۔

34 سورۃ البقرۃ 185:2۔

35 سورۃ الاحزاب 33:41-42۔

36 سورۃ البقرۃ 43:2۔

37 سورۃ آل عمران: 97۔

38 سورۃ البقرۃ 183:2۔

39 سورۃ البقرۃ 274:2۔

40 سورۃ الاسراء 34:17۔

41 سورۃ البقرۃ 282:2۔

42 ایضاً۔

43 سورۃ النساء 86:4۔

44 سورۃ الحجرات 11:49۔

45 سورۃ الحجرات 13:49۔

46 سورۃ الحجرات 11:49۔

47 سورۃ الحجرات 12:49۔

48 سورۃ الحجرات 6:49۔

49 سورۃ الحجرات 10:49۔

50 سورۃ البقرۃ 204:2۔

51 سورۃ البقرۃ 205:2۔

52 سورۃ الفتح 29:48۔

53 سورۃ الاسراء 57:17۔

54 سورۃ لقمان 19:31۔

55 سورۃ الاسراء 37:17۔

56 سورۃ الفرقان 63:25۔

57 سورۃ الاسراء 36:17۔

58 سورۃ الحجرات 12:49۔

59 سورۃ الحجرات 11:49۔

60 سورۃ النور 27:24۔

61 سورۃ النساء 36:4۔

62 سورۃ النجم 32:53۔

63 سورۃ الاسراء 34:17۔

64 سورۃ الاسراء 188:17۔

65 سورۃ آل عمران 3:185۔

66 سورۃ آل عمران 3:145۔

67 سورۃ البقرۃ 2:96۔

68 سورۃ البقرۃ 2:95۔

69 سورۃ البقرۃ 2:274۔

70 مسلم، ابن الحجاج القشیری، **صحیح مسلم**، (ترکی: دار الطباعۃ العامرۃ، 1334ھ)، کتاب الزهد والرقائق، باب الدنیاسجن المومن وجنۃ الکافر، رقم الحدیث: 2960۔

71 ایضاً، کتاب الوصیة، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته، رقم الحدیث: 1631۔

72 البخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب النکاح ، باب الترغیب فی النکاح، رقم الحدیث: 4776۔

73 سورۃ الحدید 57:27۔

74 البخاری، **الجامع الصحیح**، کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم الحدیث: 6137۔